© rasailojaraid.com

تدبر قرآن- تفسیروں میں ایک منفرد تفسیر

محمد عنایت اللہ سبحانی

(۲)

پانچویں خصوصیت:

تدبر قرآن کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ قرآن پاک میں آیات کے آخر میں یا درمیان میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات آتی ہیں، ان صفات پر بھی مولانا اصلاحی نظم کلام کی روشنی میں غور وخوض کرنے اور ان سے بڑے قیمتی نتائج اخذ کرتے ہیں۔ یہ چیز ''تدبر قرآن'' کی امتیازی خصوصیات میں شمار کی جائے گی۔

عام طور سے تفسیروں میں، خواہ وہ عربی تفاسیر ہوں یا اردو، اس پہلو پر توجہ نہیں دی گئی ہے اور اگر کہیں دی بھی گئی ہے تو محض اس صفت کی لغوی تشریح کی حد تک۔ تدبر قرآن شاید اس لحاظ سے ایک منفرد تفسیر ہے کہ اس میں صفات الٰہی پر اچھی گفتگو ملتی ہے۔ یہ وضاحت ملتی ہے کہ ان صفات کی روح کیا ہے؟ اور وہ جہاں آتی ہیں، کس مناسبت سے آتی ہیں۔

عزیزٌ حکیم کی معنویت:

مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی ایک آیت ہے:

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً وصیة لأزواجهم متاعا إلی الحول غیر إخراج فإن خرجن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی أنفسهن من معروف. واللہ عزیز حکیم۔ (۲۴۰)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا آخر میں فرماتے ہیں:

''(عزیز حکیم) کی صفات خدا کے حق قانون سازی، اوراس کے قانون کے پر حکمت ہونے کی طرف بھی اشارہ کررہی ہیں اوراس کی خلاف ورزی کے نتائج کی طرف بھی۔ اسلام میں تمام دین وشریعت اور تمام امرونہی کی بنیاد خدا کی صفات ہی پر ہے۔ اس وجہ سے کہیں بھی ان کو محض برائے بیت نہیں خیال کرنا چاہیے۔ بلکہ ہر جگہ ان پر اسلام کے فلسفۂ قانون اور فلسفۂ اخلاق کی بنیاد کی حیثیت سے غور کرنا چاہیے۔'' [۲۷]

علیٌ حکیمٌ کی معنویت:

سورۂ شوریٰ کی ایک آیت ہے:

وما كان لبشر أن يكلمه الله الا وحيا أو من وراء حجاب،
أويرسل رسولاً فيوحي بإذنه ما يشاء إنه علي حكيم۔ (آیت:۵۱)

اس آیت کے آخر میں علیٌ حکیمٌ کی صفت کیوں آئی ہے؟ اس کی کیا مصلحت ہے؟ علیٌ اور حکیمٌ ان دونوں صفات میں باہم کیا تعلق ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی دوصفتوں کا حوالہ دیا ہے۔ ایک اس کی عظمت، رفعت اور بالاتری کو ظاہر کرتی ہے۔ دوسری اس کی حکمت اور اس حکمت کے لوازم- رحمت، عدل اور ہدایت خلق- کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ ان دونوں کو جمع کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اتنی بلند وبالا ہے کہ نہ اس کو کسی سے کلام کی ضرورت ہے اور نہ کوئی یہ درجہ ومرتبہ رکھتا ہے کہ اس سے ہم کلام ہو سکے، لیکن اس عظمت ورفعت کے ساتھ وہ حکیم، عادل اور رحیم بھی ہے۔ اس وجہ سے وہ خلق کی رہنمائی اور اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے ان کو اپنے خطاب وکلام سے بھی نوازتا ہے اور اس کے لیے اس نے وہ طریقے اختیار فرمائے، جو اوپر مذکور ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے آگے بڑھ کر جو لوگ یہ مطالبہ کررہے ہیں کہ خدا ان میں سے ہر ایک سے رودررو ہو کر بات کرے، تو اس قسم کے لوگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ خدا کی عظمت سے آگاہ ہیں، نہ اپنی بے حقیقتی سے!! ایسے احمق لوگ اپنی رعونت ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوں گے۔'' ۲۸؎

أحدٌ اور الصمد کی معنویت:

سورۂ اخلاص کی پہلی دو آیتیں ہیں: قل هو الله أحد الله الصمد ۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی صفت اُحد کے بعد دوسری صفت الصمد کیوں آئی ہے؟ ان دونوں صفات میں کیا رشتہ ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:

''جس طرح غنیٌّ کے بعد قرآن میں حمیدٌ کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے بطور بدرقہ آئی ہے، اسی طرح یہاں اُحد کے بعد صمد کی صفت بطور بدرقہ ہے۔ غنیٌّ اور حمیدٌ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ لفظ غنیٌّ سے خدا کی بے نیازی کا جو تصور ذہن میں آتا ہے، اس سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے بالکل بے تعلق ہے۔ اس کا اثر ان پر یہ پڑتا ہے کہ وہ اس کو اپنی رسائی سے بالاتر سمجھ کر دوسروں کے سہارے پکڑتے ہیں۔

لوگوں کو اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت غنیٌّ کے ساتھ حمیدٌ کا بھی ذکر فرمایا ہے، مقصود یہ رہنمائی دینا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہونے کے ساتھ ساتھ تمام سزاوار حمد کاموں کا منبع بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کے بندوں کو چاہیے کہ ہمیشہ اسی سے لو لگائیں۔ کبھی اس سے مایوس ہو کر دوسروں کا سہارا نہ پکڑیں۔

ٹھیک اسی طرح اُحدٌ کے بعد یہاں صفت صمد کی یاددہانی فرمائی تاکہ لفظ أحدٌ سے خدا کی یکتائی و بے ہمگی کا جو تصور سامنے آتا ہے، اس سے مغلوب ہو کر کوئی اللہ تعالیٰ کو ایک بالکل الگ تھلگ اور خاموش علّۃ العلل نہ سمجھ بیٹھے۔ ورنہ یہ غلط فہمی بھی دوسرے سہاروں کی تلاش کا سبب بن سکتی ہے۔

اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے الله الصمد کہہ کر وضاحت فرمادی کہ بے شک اللہ ہے تو سب سے الگ، بے نیاز و بے ہمہ، مگر وہ سب کی خبر گیری اور دست گیری بھی کرتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے، سب کے لیے پناہ کی چٹان بھی ہے، سب کا ماویٰ و مرجع بھی ہے۔ اس کے بندے جب اس سے فریاد کرتے ہیں، وہ ان کی فریاد سنتا اور ان کی فریاد رسی کرتا ہے۔"۲۹

صفات الٰہی کا یہ باہمی رشتہ اور اس رشتے کی یہ معنویت تدبر قرآن کے علاوہ اور کہیں ہمیں نہیں ملتی۔

چھٹی خصوصیت:

تدبر قرآن کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تفسیر تمام خارجی اثرات، تمام مسلکی تعصّبات اور تمام ذہنی تحفظات سے یکسر پاک ہے۔ اس میں بس خدا کی آواز گونجتی نظر آتی ہے۔

تدبر قرآن کے مطالعہ کے دوران کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس تفسیر کا لکھنے والا پہلے سے کوئی خاص نقطۂ نظر رکھتا ہے اور اس نقطۂ نظر کو وہ قرآن سے ثابت کرنا چاہتا ہے۔ یا وہ کسی خاص مسلک کا ماننے والا ہے اور اس کے لیے وہ دلائل تلاش کر رہا ہے۔

اس کے برعکس وہ آزادانہ قرآن پر غور کرتا اور اس کی گہرائیوں میں اتر کر علم و حکمت کے لعل و گہر تلاش، کرتا ہے۔ وہ ہر اس چیز کا دل دادہ نظر آتا ہے، جو قرآن سے مأخوذ و مستنبط ہو، یا قرآن فہمی میں معاون ہو اور ہر اس چیز سے کنارہ کش نظر آتا ہے جو قرآن کے خلاف ہو، یا قرآن سے اکتسابِ فیض میں حارج ہو۔

چنانچہ مولانا اصلاحی ان روایات و آثار اور ان اقوال و آراء کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، جو قرآن کے الفاظ اور اس کے اسالیب سے میل نہ کھاتے ہوں یا ان کے خلاف نظر آتے ہوں۔ یہ قرآنی حمیت اور قرآنی غیرت ان پر اس طرح غالب رہتی ہے کہ انہیں اس کی بھی پروا نہیں ہوتی کہ اس صحرا میں وہ بالکل تن تنہا رہ گئے ہیں، یا ان کے آگے پیچھے بھی کوئی ہے۔ وہ سورۂ نور کی تفسیر میں ایک روایت پر گفتگو کرتے ہوئے جو شادی شدہ زانی کے لیے حکم رجم کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے، فرماتے ہیں:

"دوسری روایت جو اس سلسلے میں پیش کی جاتی ہے، دل پر جبر کر کے میں اس کو نقل کیے دیتا ہوں" پھر فرماتے ہیں: "میں نے، جیسا کہ عرض کیا، اس روایت کو نہایت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کراہت کے ساتھ محض اس لیے نقل کیا ہے کہ اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے راہ کی ان الجھنوں کو صاف کرنا ضروری ہے جو زنادقہ کی پھیلائی ہوئی ہیں اور ہمارے مفسرین اور فقہاء کی سادگی کی وجہ سے تفسیر اور فقہ کی کتابوں میں بھی ان کو جگہ مل گئی ہے۔

اس روایت پر غور کیجیے تو ہر پہلو سے یہ کسی منافق کی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور مقصود اس کے گھڑنے سے قرآن کی محفوظیت کو مشتبہ ٹھہرانا اور سادہ لوحوں کے دلوں میں یہ وسوسہ پیدا کرنا ہے کہ قرآن کی بعض آیات قرآن سے نکال دی گئی ہیں۔'' ۳۰

فقہاء کی ایک رائے پر فقیہانہ تبصرہ:

وہ تفسیر سورۂ نور کے ضمن میں فقہاء کی ایک رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''چوتھی قید فقہاء کے ایک گروہ نے یہ عائد کی ہے کہ یہ حد صرف مسلمانوں پر نافذ ہوگی۔ غیر مسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اسلامی حکومت میں غیر مسلم رعایا اپنے پرسنل لا کی حد تک تو بے شک حکومت کے عام قوانین سے مستثنیٰ ہوگی۔ لیکن حدود و تعزیرات سے، جن کا تعلق ملک کے امن و عدل سے ہے، اس کو مستثنیٰ رکھنا کس طرح ممکن ہے؟

اگر ایک مسلمان کو بجرم زنا آپ کوڑے لگائیں یا رجم کریں اور اسی جرم میں ایک غیر مسلم پر کوئی گرفت نہ کریں یا کوئی دوسری معمولی سزا دیں تو زنا کا سد باب ناممکن ہوگا۔

یہی حال چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا کا ہے۔ اگر ایک اسلامی حکومت چوری کے جرم میں مسلمانوں کے تو ہاتھ کاٹے، لیکن اپنی غیر مسلم رعایا کو اس حد سے مستثنیٰ رکھے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ مسلمانوں کو چوری سے روک کر اپنے ملک میں غیر مسلموں کو چوری کا لائسنس دے رہی ہے۔ یہ بات بالبداہت خلاف عقل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی۔ آنحضرتؐ نے بھی غیر مسلموں پر حدود جاری فرمائیں اور خلفائے راشدین نے بھی۔ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق کی وضاحت ہم نے اپنی کتاب اسلامی ریاست میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں''۔ ۳۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا اصلاحی تفسیر آیات یا قرآن سے استدلال کے باب میں کبھی کسی کی اندھی تقلید نہیں کرتے۔ وہ محدثین کی روایات کو بھی قرآن کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ وہ فقہاء کی فقہی رایوں کو بھی قرآن کے آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ وہ مفسرین کی تفسیری آراء کو بھی قرآن کے الفاظ، آیت کے اسلوب، قرآنی نظائر، آیات کے سیاق وسباق کی روشنی میں پرکھتے ہیں اور جب ہر پہلو سے اطمینان ہو جاتا ہے، تب انہیں قبول کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تفسیر میں جگہ جگہ مفسرین کی رایوں سے اختلاف کرتے ہیں۔ فقہاء کی فقہی رایوں پر بھی نقد کرتے ہیں اور محدثین کی تخریج کردہ روایات کی بھی چھان پھٹک کرتے ہیں۔

بزرگ استاذ سے علمی اختلاف:

اپنے بزرگ استاذ امام حمید الدین فراہی سے انہیں جو والہانہ لگاؤ ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ تدبر قرآن کے افق پر بار بار اس محبت کی ضوفشانی نظر آتی ہے۔ لیکن مولانا اصلاحی اپنے اس محبوب و بزرگ استاذ کی رائیں بھی اس وقت تک قبول نہیں کرتے، جب تک انہیں اپنے خراد پر کس نہیں لیتے اور ان کی صحت کی طرف سے پورا اطمینان نہیں کر لیتے۔ یہی وجہ ہے وہ اپنی تفسیر میں بسا اوقات اپنے بزرگ استاذ کی رایوں پر بھی کلام کرتے اور ان سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔

مثال کے طور پر وہ تفسیر کے آغاز میں ہی آیۂ بسم اللہ کی نوعیت اور حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”مدینہ، بصرہ اور شام کے قرّاء اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ قرآن کی سورتوں میں سے کسی سورہ کی بھی (بشمول سورۂ فاتحہ) آیت نہیں ہے، بلکہ ہر سورہ کے شروع میں اس کو محض تبرک اور ایک علامت فصل کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ اس سے ایک سورہ دوسری سورہ سے ممتاز بھی ہوتی ہے اور قاری جب اس سے کسی سورہ کا افتتاح کرتا ہے تو اس سے برکت بھی حاصل کرتا ہے۔ یہی مذہب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔“

پھر آگے مولانا لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ اس کو سورۂ فاتحہ کی ایک آیت اور دوسری سورتوں کے لیے بمنزلہ فاتحہ مانتے ہیں۔ مجھے قوی مذہب قرّاء مدینہ کا معلوم ہوتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب تمام تر وحی الٰہی کی رہ نمائی اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی ہے اور بسم اللہ کی کتابت بھی اسی ترتیب کا ایک حصہ ہے۔اس ترتیب میں جہاں تک بسم اللہ کے لکھے جانے کی نوعیت کا تعلق ہے سورۂ فاتحہ اور غیر سورۂ فاتحہ میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ہر سورہ کے آغاز میں اس کو ایک ہی طرح درج کیا گیا ہے۔اس کی حیثیت سورہ سے الگ ایک مستقل آیت کی نظر آتی ہے۔''۲۲

سورۂ شوریٰ کی ایک آیت:

سورۂ شوریٰ کی ایک آیت ہے: قل لا أسألكم عليه أجرا إلا المودة في القربىٰ۔ (۲۳)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

''یہاں استثناء میرے نزدیک منقطع اور قربیٰ مصدر کے مفہوم میں ہے، جس طرح زُلفیٰ اور بُشریٰ وغیرہ اس وزن کے دوسرے الفاظ ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ قریش کے ان برخود غلط لیڈروں کو آگاہ کردو کہ تمہاری تمام ناقدریوں، بے زاریوں اور دل آزاریوں کے باوجود میں اس طرح جو اپنے رات دن تمہارے پیچھے ایک کیے ہوئے ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ اس میں میری کوئی ذاتی غرض پوشیدہ ہے۔

جس کے لیے خدا کی طرف سے اس فضل عظیم کی بشارت ہے، جس کا اوپر ذکر ہوا، وہ بھلا تم سے کسی صلہ و معاوضہ کا طالب کیا ہوگا! میری یہ ساری سرگرمیاں اور بے قراریاں اس وجہ سے ہیں کہ میں اس حق قربت و قرابت سے سبک دوش ہونا چاہتا ہوں جو تمہارے اور میرے مابین ہے۔تم میرے خاندان اور میری قوم کے لوگ ہو، اس وجہ سے مجھ پر یہ حق ہے کہ جو ہدایت اور آگاہی خدا کی طرف سے میں لے کر آیا ہوں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سے سب سے پہلے تم کو آگاہ کروں، اور جس رحمت کی منادی کر رہا ہوں، اس میں سب سے پہلے تمہیں شریک کرنے کی کوشش کروں۔"

پھر آگے مولانا اصلاحی فرماتے ہیں:

"استاذ امام اس آیت کو ذرا مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس استثناء کو استدراک کے مفہوم میں لیتے ہیں اور آیت کی تأویل سورۂ سبا کی آیت ۴۷: قل ما سألتكم من أجر فهو لكم إن أجرى إلا على الله کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ میں جو تمہیں صلۂ رحم، ادائے حقوق اور انفاق کی دعوت دیتا ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ یہ میں کوئی ذاتی غرض سامنے رکھ کر کر رہا ہوں۔ بلکہ یہ تمہاری ہی دنیا اور آخرت کی بہبود کے لیے ہے۔ یہ مال تمہارے اغنیاء سے لے کر تمہارے ہی غرباء میں تقسیم کر دیا جائے گا اور اس طرح میں تمہیں مودت فی القربیٰ کی راہ دکھا رہا ہوں۔ اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔[۳۳]

ایک دوسری آیت:

اسی سورۂ شوریٰ میں ایک دوسری آیت ہے: ما كنت تدرى ما الكتاب ولا الإيمان۔ (۵۲)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"کتاب اور ایمان میں وہی نسبت ہے جو نسبت قالب اور روح میں ہے۔ کتاب تمام تر ایمان کا مظہر اور بروز ہے۔ سادہ الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کتاب درحقیقت ایمان کے مقتضیات کا بیان ہے۔ اس وجہ سے دونوں میں جسم و جان کا رابطہ ہے۔ جہاں تک "کتاب" کا تعلق ہے تو اس سے تو نبی ﷺ نا آشنا تھے، اس لیے کہ آپ امّی تھے۔ لیکن ایمان سے آشنائی کی جو نفی کی گئی ہے، یہ اس کی تفصیلات اور مقتضیات کے اعتبار سے ہے۔ یعنی آپ ایمان کے تمام لوازم و مقتضیات سے نا آشنا تھے۔ ورنہ حضرت انبیاء علیہم السلام تو وحی سے پہلے بھی اپنی فطرت سلیم کی روشنی سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وجہ سے اجمالی ایمان ان کے اندر موجود ہوتا ہے، جو وحی کی روشنی سے جگمگا کر آفتاب کی طرح ایک عالم کو منور کر دیتا ہے۔

فطرت کی روشنی اور وحی کی روشنی میں نسبت چونکہ ذرّہ اور آفتاب کی ہے، اس وجہ سے اس کے مقابل میں اس کی نفی کی گئی ہے۔ لیکن ہے وہ اسی آفتاب تاباں کا ایک ذرّہ، اور وہی لوگ نور نبوّت سے اکتساب بھی کرتے ہیں، جو اس ذرّہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس سے محروم کر لیتے ہیں، وہ نبی کے انوار سے محروم ہی رہتے ہیں۔" ۳۴ے

آیت کی یہ تاویل رقم فرمانے کے بعد مولانا اصلاحی مزید فرماتے ہیں:

"استاذ امام یہاں ایمان سے حکمت مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایمان قول، عمل اور حال تینوں کا مجموعہ ہے۔ اور یہی حقیقت حکمت کی بھی ہے۔ اس وجہ سے یہ جو فرمایا کہ تم کتاب اور ایمان سے نا آشنا تھے، تو دوسرے الفاظ میں گویا یہ فرمایا کہ تم کتاب اور حکمت سے نا آشنا تھے۔ گویا ایمان کے لفظ سے یہاں حکمت کی تفسیر فرما دی گئی۔" ۳۵ے

ساتویں خصوصیت:

تدبر قرآن کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مقام رسالت اور منصب نبوت کا صحیح ادراک پایا جاتا ہے۔ اس میں رسالت کا وہ متوازن تصور پایا جاتا ہے، جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ اس میں حب رسول اور عشق رسول کی گرمی بھی ہے اور آپؐ کے مقام و منصب اور آپ کی جلالت قدر کا صحیح عرفان بھی۔ اس میں رسالت و نبوت کی عظمت شان کا ایسا ادراک پایا جاتا ہے کہ اس تک اچھے اچھے عاشقین رسول کو پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔

ہم اپنے اس دعوے کو چند مثالوں سے ثابت کریں گے:

(۱) سورۂ انفال کی ایک آیت ہے:

ما كان لنبي أن يكون له أسرى حتى يثخن في الأرض تريدون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عرض الدنیا واللہ یرید الآخرۃ واللہ عزیز حکیم ۔(۶۷)

اس آیت کے بارے میں تمام مفسرین یہ لکھتے ہیں کہ نبی ﷺ نے بدر کے قیدیوں سے فدیہ لے کر انہیں آزاد کردیا تھا۔ یہ آپ کی بڑی بھاری غلطی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر یہ عتاب ہوا۔اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

مقام رسالت کا صحیح ادراک:

مولانا اصلاحی مفسرین کی اس تاویل پر شدید احتجاج کرتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں:

''اس آیت کا مخاطب مسلمانوں کو، اور وہ بھی سید عالم ﷺ اور صدیق اکبر کو ماننے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔اور بالفرض اس آیت کا مخاطب دل پر جبر کرکے نبیؐ اور صدیقؓ کو تھوڑی دیر کے لیے کوئی مان بھی لے،تو اس کے بعد جو آیت آرہی ہے،اس کا مخاطب نبیؐ اور صدیقؓ کو ماننے کے لیے کوئی دل وجگر کہاں سے لائے؟!''[۳۶]

مولانا اصلاحی کی یہ سطریں حب رسول، تعظیم رسول، تکریم رسول، حبّ صحابہ اور توقیر صحابہ کی جو حرارت لیے ہوئے ہیں، وہ محتاج بیان نہیں۔ وہ مقام جہاں بلا استثناء تمام مفسرین کے قدم پھسل گئے اور وہ عظمت رسالت کو ملحوظ نہ رکھ سکے، وہاں بھی مولانا اصلاحی حبِ رسول اور عظمت رسالت کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اور دوسروں کی غفلت پر برہم بھی ہیں اور کبیدہ خاطر بھی۔

(۲) نبیؐ پر جادو کی حقیقت:

سورۂ فلق کی چوتھی آیت: **ومن شرّ النفّٰثٰت فی العقد** کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

''**نفّٰثٰت فی العقد** سے وہ عورتیں یا وہ جماعتیں یا وہ نفوس مراد ہیں جو ساحرانہ عمل کرنے کے وقت کسی تانت یا رسّی یا بال وغیرہ میں کچھ پڑھ کر اور پھونک مار کر گرہ لگایا کرتے ہیں۔ حضورؐ پر جو سحر لبید بن اُعصم نے کیا تھا، لکھا ہے کہ بعض لڑکیاں بھی اس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شریک تھیں۔'' ۳۷؎

مولانا مودودیؒ اس قصۂ سحر کو اور شدّ ومدّ سے پیش کرتے ہیں۔ وہ سورۂ فلق کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''جہاں تک تاریخی حیثیت کا تعلق ہے، نبی ﷺ پر جادو کا اثر ہونے کا واقعہ قطعی طور پر ثابت ہے اور علمی تنقید سے اس کو اگر غلط ثابت کیا جا سکتا ہو، تو پھر دنیا کا کوئی تاریخی واقعہ بھی صحیح ثابت نہیں کیا جاسکتا۔'' ۳۸؎

مفسرین، محدثین اور مورخین کی ایک لمبی قطار ہے جو اس قصۂ سحر کو ایک ثابت شدہ واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتی چلی آئی ہے۔ لیکن مولانا اصلاحی اس جم غفیر سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوتے۔ وہ اس معاملے کو خالص قرآنی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اسے وحی و رسالت کے لیے کھلا ہوا چیلنج سمجھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک اس شان نزول کو رد کرنے کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ اس مسلمہ عقیدے کے بالکل منافی ہے جو قرآن نے انبیاء علیہم السلام سے متعلق ہمیں تعلیم کیا ہے۔ عصمت حضرات انبیاء علیہم السلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جو کسی وقت بھی ان سے منفک نہیں ہوسکتی۔ اس عصمت کو اس امر سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کہ نبیؑ کے دندان مبارک شہید ہوگئے۔ یا وہ زخمی ہوگیا یا وہ قتل کردیا گیا۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اس کی نبوت میں قادح نہیں ہے، کہ آپ اس کو اس امر کی دلیل بنائیں کہ جب نبی ان چیزوں میں مبتلا ہوسکتا ہے تو مسحور بھی ہوسکتا ہے، یہاں تک کہ اس کو کردہ اور ناکردہ، دیدہ اور نادیدہ میں کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے شیطانی تصرفات سے اپنے نبیوں کو محفوظ رکھا ہے اور ان کی یہ محفوظیت دین کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ محفوظیت ہی نبی کے ہر قول و فعل کو سند بناتی ہے۔ پورا قرآن انبیاء کی عصمت پر گواہ ہے اور ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ ان کی عصمت پر ایمان رکھے۔'' ۳۹؎

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت زینب کا واقعہ:

سورۂ احزاب میں حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت زینب بنت جحشؓ کا جو واقعہ بیان ہوا ہے، وإذ تقول للذی أنعم الله علیه وأنعمت علیه۔ (آیت:۳۷) مولانا اصلاحی پہلے تو واقعہ کی وہ شکل بیان فرماتے ہیں جو قرآن کے الفاظ، اور آیات کے ماحول یا پس منظر سے ظاہر ہوتی ہے اور جو نبی ﷺ کے اس خلق عظیم کی ترجمان ہے، جو آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔

پھر وتخفی فی نفسک ما الله مبدیه کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس ٹکڑے کے تحت ہمارے غیر محتاط مفسرین نے فضول قسم کی جو روایات نقل کر دی ہیں، ان سے تعرض کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بالکل بے اصل ہیں۔ ابن کثیر کا تبصرہ ان پر بالکل صحیح ہے۔ ہمارا قول بھی ان کے باب میں یہی ہے۔ تردید کے لیے بھی ان کو نقل کرنا ہم معصیت سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ابن جریر کو معاف کرے۔ وہ روایات نقل کرنے کے معاملے میں نہایت ہی غیر محتاط ہیں۔''[۴۰]

مولانا اصلاحی کا کلک گہربار جو ہمیشہ حبِ رسول سے سرشار رہتا ہے، وہ اس طرح کی روایتوں سے آلودہ ہونا کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے مواقع پر ضبط سے کام لینا ان کے لیے بہت دشوار ہوتا ہے۔

سورۂ حج کی آیت:

سورۂ حج کی ایک آیت ہے: وما أرسلنا من قبلک من رسول ولا نبیّ۔ (آیت:۵۲)

مفسرین کی ایک بڑی جماعت اس آیت کا سبب نزول ایک ایسے واقعہ کو بتاتی ہے، جس کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو نبوت و رسالت کی عصمت مجروح ہوتی اور وحی الٰہی کا اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ مولانا اصلاحی پورے شرح و بسط کے ساتھ اس آیت کا صحیح مفہوم واضح کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''اس آیت کی توضیح میں ہم نے اس قدر تفصیل سے صرف اس لیے کام لیا ہے کہ کسی کے ذہن میں کوئی خلجان باقی نہ رہ جائے۔ اس توضیح کے بعد اس فضول سی روایت کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی، جو ہمارے مفسرین نے، اللہ ان کو معاف کرے، اپنی کتابوں میں اس آیت کے شان نزول کی حیثیت سے درج کردی ہے۔

اول تو یہ آیت، جیسا کہ آپ نے دیکھا، کسی شان نزول کی محتاج نہیں ہے۔ بلکہ اپنے مفہوم و مدعا میں بالکل واضح اور اپنے سابق و لاحق سے بالکل مربوط ہے۔ پھر ستم یہ ہے کہ جو روایت یہ حضرات نقل کرتے ہیں، نہ اس کا روایت کے اعتبار سے کوئی وزن ہے، نہ درایت کے پہلو سے۔ بلکہ وہ محض زنادقہ کا ایک القائے شیطانی ہے جو انھوں نے حضرات انبیاء علیہم السلام کی عصمت کو مجروح کرنے کے لیے گھڑا اور حضرات مفسرین اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اس کو اپنی کتابوں میں نقل کرتے آرہے ہیں۔''[۱۳]

حضرت داؤدؑ کا واقعہ:

مولانا اصلاحی رسالت و نبوت کی عظمت شان کے اس درجہ قائل، اور عصمت انبیاء کے معاملے میں اس قدر حساس ہیں کہ چاہے رسول خدا محمد بن عبداللہ ﷺ کا معاملہ ہو یا سابق انبیاء و رسل کا، وہ کسی کے بارے میں بھی کوئی ایسی بات یا کوئی ایسا واقعہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جس سے اس کی عصمت یا اس کی شان رسالت پر آنچ آتی ہو۔ اس کے برعکس وہ ہر ایسی بات یا ہر ایسا واقعہ سن کر مضطرب ہوجاتے، اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، کہ **سبحانک ھذا بھتان عظیم!**

سورۂ ص میں حضرت داؤدؑ کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے: **وھل أتاک نبأ الخصم إذ تسوّروا المحراب** الخ۔ (آیت: ۲۱)

مولانا اصلاحی پہلے تو واقعہ کی وہ شکل پیش کرتے ہیں، جو متعلقہ آیات کے الفاظ و اسلوب سے ظاہر ہوتی ہے، جو حضرت داؤدؑ کے شایان شان اور ان کی عظمت کردار اور شان اوّابیت کی آئینہ دار ہے۔ پھر عام مفسّرین اس واقعہ کی جو بدنما تصویر پیش کرتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، ایک ایسی تصویر جو اس عبد اوّاب اور اس نبی منیب کو ثریا کی بلندیوں سے اتار کر ثری کی پستیوں میں پہنچا دیتی ہے، اس جھوٹی تصویر پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قرآن کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے، وہ تو زیادہ سے زیادہ اسی حد تک جاتی ہے۔ رہے وہ مزخرف قصے جو تفسیر کی بعض کتابوں میں نقل ہوئے ہیں، تو ان کی نسبت ہماری دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو معاف کرے جو اپنی کتابوں میں ان کو نقل کرنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔"[۲۲]

ہوسکتا ہے اس طرح کے جملے قارئین کو سخت معلوم ہوں، اور وہ انہیں مولانا اصلاحی کی شعلہ مزاجی پر محمول کریں۔ لیکن ہمارا احساس اس سے مختلف ہے۔ ہم سمجھتے ہیں موقع کی نزاکت اسی شدت احتجاج کی متقاضی تھی۔ یہاں معاملہ نبی کی عصمت اور وحی الٰہی کی محفوظیت کا ہے۔ جہاں نبی کی عصمت اور وحی کی محفوظیت کا سوال پیدا ہو جائے، وہاں ایک ایسے شخص کے لیے اپنے قلم کو قابو میں رکھنا بہت دشوار ہے، جس کے سینے میں قرآن سے عشق اور رسول سے محبت کی آگ دہک رہی ہو۔ یہ غیرت حق کا فطری تقاضا ہے۔ اس کی تعریف و تحسین تو کی جا سکتی ہے، اس کی مذمت یا اس کی شکایت نہیں کی جا سکتی۔

اسی طرح کی روایتیں ہیں جن پر مولانا اصلاحی احتجاج کرتے ہیں تو اسے انکار سنت اور انکار حدیث کا نام دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ احتجاج در اصل نتیجہ ہوتا ہے سنت اور صاحب سنت سے بے پناہ محبت کا۔ لوگ تو بحثیں کر رہے ہوتے ہیں راویوں کی ثقاہت اور عدم ثقاہت پر، ان کی قلت اور کثرت پر، ان کی شہرت اور ان کے خمول پر، ادھر مولانا اصلاحی اپنا سر پیٹ رہے ہوتے ہیں، کہ اس طرح کی روایتوں کو اگر مان لیا گیا تو انبیاء اور سید انبیاء کی عصمت، آپ کی شان رسالت اور آپ کے خلق عظیم کا کیا بنے گا!! پھر قرآن اور اس کی آیت بیّنات کا کیا بنے گا، اگر ان روایات کے سبب ان کا اور ان کے مفاہیم کا شیرازہ بکھیر دیا گیا؟

کیا آپؐ نے اس دنیا سے جاتے جاتے سب سے زیادہ تمسک بالکتاب پر زور نہیں دیا تھا؟ پھر کیا قرآن سے بھی زیادہ کوئی قیمتی چیز ہے جو نبی ﷺ کے ذریعہ ہم کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل ہوئی ہو؟ اور جس کی حفاظت ہم پر فرض ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ مولانا اصلاحی اور ان کے بزرگ استاذ امام حمید الدین فراہی کے ہاں اس طرح کی جتنی تحریریں بھی ہیں، ان سب کے پیچھے حبِ رسول اور احترام رسول کا جذبۂ بے پناہ کارفرما ہے۔ ورنہ مولانا اصلاحی ہوں یا امام فراہی، ان میں سے کسی کے ہاں بھی حدیث وسنت کی اس سے کم اہمیت نہیں، جتنی کہ ائمہ حدیث کے ہاں نظر آتی ہے۔

تدبر قرآن میں اس طرح کے درجنوں مقامات ہیں، جہاں مولانا اصلاحی نے احادیث اور سنت رسول کی اہمیت پر زور دیا ہے اور یہ تحریریں اس قدر واضح ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی اس مکتب فکر پر حدیث سے بے اعتنائی الزام لگاتا ہے، تو پھر اسے روز حساب کا انتظار کرنا چاہیے۔

پیغمبر کی تعلیم عین اللہ تعالیٰ کی تعلیم:

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۹ کے ضمن میں مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

کما علمکم ما لم تکونوا تعلمون ۔ سے یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ پیغمبر ﷺ کی تعلیم عین اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں نماز کا حکم تو ہوا ہے، لیکن اس کے ادا کرنے کا طریقہ کہیں نہیں بتایا گیا ہے۔ یہ چیز صرف پیغمبر کی تعلیم سے امت کو معلوم ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود فرمایا کہ:

''جیسا کہ اس نے تعلیم دی'' اب سوال یہ ہے کہ اگر پیغمبر کی تعلیم عین اللہ کی تعلیم نہیں ہے تو وہ کیا چیز ہے۔ جس کو یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیم سے تعبیر فرمایا ہے۔ ۳۴

خدا کی محبوبیت کا راستہ رسول کی پیروی:

سورۂ آل عمران کی آیت ۳۱: إن کنتم تحبون اللہ فاتبعونی کے تحت مولانا رقم طراز ہیں:

''خدا کی محبوبیت کا راستہ بھی رسول ؐ کی پیروی ہی ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسول کی سنت سے منحرف ہو اور وہ اس زعم میں مبتلا ہو کہ وہ خدا کا محبوب ہے، یا دوسرے اس کو محبوب خدا سمجھیں تو یہ بالکل خبط ہے۔''۴۴؎

نبی کا فرض کیا ہوا اللہ تعالیٰ کا فرض کیا ہوا:

سورۂ نساء کی آیت ۱۰۳: إن الصلاۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا۔ کے تحت مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

''اس آیت سے دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ نبی ﷺ نے اہل ایمان پر جو کچھ فرض کیا ہے، وہ عین اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ فریضہ ہے۔ یہ بات اس طرح نکلتی ہے کہ نمازوں کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ اوقات کے اہتمام کے ساتھ فرض ہیں، درانحالیکہ اوقات نماز تمام تر نبی ﷺ کے مقرر کردہ ہیں۔ قرآن میں ان کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کچھ اشارات ہیں''۴۵؎

سورۂ حجرات کی آیت: إن الذین یغضّون أصواتھم عند رسول اللہ اولئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقویٰ لھم مغفرۃ وأجر عظیم (آیت:۳) کے تحت مولانا لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو تقوی کے لیے منتخب فرماتا ہے جو اس کی کتاب اور رسول کی سنت کے سامنے فروتنی کی یہی روش اختیار کرتے ہیں، جس کی ہدایت رسول کے معاملے میں ہوئی ہے۔ جس شخص کے اندر اللہ و رسول کی ہر بات کے آگے سر جھکا دینے کا سچا جذبہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے تقویٰ کی راہیں کھولتا ہے اور ہر قدم پر غیب سے اس کی رہ نمائی ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس خبط میں مبتلا ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی اصلاح کرنے کی پوزیشن میں ہے، تو اس کا یہ پندار اس کے سارے عمل کو غارت اور اس کی آخرت کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔''۴۶؎

سورۂ احزاب کی آیت: واذ کرن مایتلی فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ (۲۴) کے تحت مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''جس طرح آپ کا ہر قول لوگوں کے لیے تعلیم و ہدایت تھا، اسی طرح آپ کا ہر فعل بھی لوگوں کے لیے اسوہ و نمونہ تھا۔ آپ کی زندگی پرائیوٹ اور پبلک کے الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں تھی، بلکہ آپ کی حیات مبارک کا ہر لمحہ امت کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف تھا۔'' ۴۷

تدبر قرآن سے یہ پانچ اقتباسات ہیں، جو حدیث و سنت کے باب میں مولانا اصلاحی کا موقف سمجھ لینے کے لیے کافی ہیں۔ ''نبی ﷺ نے اہل ایمان پر جو کچھ فرض کیا ہے، وہ عین اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ فریضہ ہے۔'' یا ''پیغمبر ﷺ کی تعلیم عین اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہے'' کیا حدیث و سنت کی اہمیت میں ان سے زیادہ بلیغ عبارتیں بھی کسی نے لکھی ہیں؟ اور کیا حدیث و سنت کی شان میں اس سے زیادہ بھی کچھ کہا جاسکتا ہے، جو کچھ مولانا اصلاحی نے کہہ دیا ہے؟ اس طرح کی تحریریں تدبر قرآن میں جگہ جگہ ملتی ہیں، لیکن ظاہر ہے:

ستارے گر نگاہوں سے ہیں مخفی — تو یہ ساری نگاہوں کی کمی ہے

آٹھویں خصوصیت:

تدبر قرآن کی آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ''مقام صحابیت'' کا جو ادراک پایا جاتا ہے، شرف صحابیت کا جو اجلال و اکرام پایا جاتا ہے، ازواج مطہرات کی عظمت و بلندی کا جو احساس پایا جاتا ہے، وہ دیگر تفاسیر میں نہیں۔

ہوسکتا ہے یہ انکشاف قارئین کے لیے حیران کن ہو، لیکن مثالیں سامنے آجانے کے بعد یہ حیرانی انشاء اللہ مسرت و انبساط اور تدبر قرآن کے اعتراف میں تبدیل ہوجائے گی۔

(۱) سورۂ تحریم میں نبی ﷺ کی دو ازواج مطہرات کو مخاطب کیا گیا ہے اور صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ دو ازواج حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ ہیں۔ انہیں مخاطب کر کے فرمایا گیا:

إن تتوبا إلى الله فقد صغت قلوبکما۔ (آیت: ۴)

اس آیت کا ترجمہ مترجمین اس طرح کرتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شیخ سعدی شیرازی : اگر توبہ کنید بخدائے بہتر باشد مر شمارا پس بدرستی برگشتہ است دلہائے شما۔

شاہ ولی اللہ : اے دو زن پیغامبرا اگر رجوع کنید بسوئے خدا خوش باشد ہر آئینہ کج شدہ است دل شما۔

شاہ رفیع الدین : اگر توبہ کرتی ہو تم دونوں طرف خدا کے پس تحقیق کج ہو گئے ہیں دل تمہارے۔

شاہ عبدالقادر : اگر تم دونوں توبہ کرتیاں ہو تو جھک پڑے ہیں دل تمہارے۔

مولانا محمود حسن : اگر تم دونوں توبہ کرتی ہو تو جھک پڑے ہیں دل تمہارے۔

مولانا مودودی : اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔

مولانا محمد جونا گڑھی : اگر تم دونوں اللہ کے سامنے توبہ کرلو (تو بہت بہتر ہے) یقیناً تمہارے دل جھک پڑے ہیں۔

کیا عائشہؓ وحفصہؓ کے دل کج ہو گئے تھے؟!

ان حوالوں سے یہ بات واضح ہے کہ عام اردو اور فارسی مترجمین ”فقد صغت قلوبکما“ کا ترجمہ کرتے ہیں: تمہارے دل کج ہو گئے ہیں یا سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔

جن لوگوں نے ”جھک پڑے ہیں“ ترجمہ کیا ہے، ان کا منشا بھی یہی ہے۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد عثمانی اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”کیونکہ تمہارے دل جادۂ اعتدال سے ہٹ کر ایک طرف کو جھک گئے ہیں“ [۴۸]

عربی تفاسیر کا معاملہ بھی اردو فارسی تراجم سے مختلف نہیں۔ تقریباً تمام ہی تفسیریں اسی طرح کے مفہوم پر مشتمل ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

امام زمخشری : تم نے وہ حرکت کی ہے جس پر توبہ واجب ہوتی ہے اور وہ ہے فرض محبت رسول سے تمہارے دلوں کا پھر جانا۔ [۴۹]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امام رازی : حق سے منحرف ہوگئے۔(عدلت و مالت عن الحق)۵۰

امام قرطبی : کج ہوگئے۔حق سے منحرف ہوگئے (زاغت و مالت عن الحق)۵۱

امام ابوحیان : راہ راست سے ہٹ گئے (مالت عن الصواب) ۵۲

ایک طرف یہ تفسیریں اور یہ ترجمے ہیں، جن میں سیدہ عائشہؓ اور سیدہ حفصہؓ کی طرف دل کے کج ہونے، حق سے منحرف ہونے، راہ حق سے ہٹ جانے، فرض محبت رسول سے پھر جانے کی نسبت کی گئی ہے۔

سبحان اللہ، دل کا کج ہوجانا، یا حق سے منحرف ہوجانا کتنی سنگین بات ہے! اور وہ بھی امہات المؤمنین کے لیے!! امہات المؤمنین میں بھی سیدہ عائشہؓ اور سیدہ حفصہؓ کے لیے!!

امّہات المؤمنین کے شایان شان مفہوم:

مولانا اصلاحی کا احسان مانیے کہ انہوں نے متعدد دلائل سے اس مفہوم کو غلط ثابت کیا اور اس کا وہ مفہوم پیش کیا جو امہات المؤمنین کے شایان شان تھا۔

مولانا اصلاحی پہلے تو اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں کہ لفظ ''صغت'' کا یہ ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

لفظ ''صغو'' عربی میں کسی شے سے انحراف کے معنی میں نہیں، بلکہ کسی شے کی طرف جھکنے اور مائل ہونے کے معنی میں آتا ہے۔

پھر وہ اپنے بزرگ استاذ امام حمید الدین فراہی کی تفسیر سورۂ تحریم کے حوالے سے نہایت تفصیل کے ساتھ اس لفظ کی لغوی تحقیق بیان فرماتے ہیں اور اس ضمن میں متعدد عربی اشعار اور لغوی استعمالات کا حوالہ دیتے ہیں، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

لفظ ''صغو'' کی مفصل لغوی تحقیق نقل کرنے کے بعد وہ امام فراہی کے یہ بصیرت افروز جملے بھی نقل کرتے ہیں:

''جن لوگوں کو حق کی تلاش ہے، ان کے لیے یہ شواہد بس ہیں، وہ ان سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطمئن ہو جائیں گے اور گھڑنے والوں نے روایات و آثار میں جو زہر ملایا ہے، اس سے وہ متاثر نہ ہوں گے۔ انہوں نے جب کتاب الٰہی میں کسی لفظی تحریف کی راہ مسدود دیکھی تو معنوی تحریف ہی کی کچھ راہیں کھول لیں اور صغو کے معنی زیغ کے کر دیے۔ حالانکہ دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔'' ۵۳؎

مولانا اصلاحی عام مفسرین و مترجمین کے ترجمہ و تفسیر کی کمزوری واضح کرنے کے بعد، آیت کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں:

''اگر تم اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی بات تمہارے شایان شان ہے، اس لیے کہ تمہارے دل تو اللہ کی طرف جھکے ہوئے ہیں ہی''

مولانا اس مفہوم کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہاں نفسیات انسانی کی یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ جب روٹھنے کا سبب محبت و اعتماد ہو، تو خفگی محض ظاہر کا پردہ ہوتی ہے، جس کے پیچھے نہایت گہری خواہش ملاپ کی موجود ہوتی ہے۔

دل کے ہر گوشے میں بے قراری:

یہاں بھی یہی صورت تھی، دونوں بیویاں بظاہر روٹھ گئیں، لیکن دل کے ہر گوشے میں یہ بے قراری موجود تھی، کہ حضورؐ کی طرف سے ذرا سا ملاطفت کا اظہار ہو، تو وہ خفگی کا یہ مصنوعی پردہ اٹھا دیں۔ لیکن حضورؐ اپنے رویہ میں کوئی نرمی اس وجہ سے پیدا نہیں کر سکتے تھے، کہ آپ کو گھر والوں کو یہ تعلیم دینی تھی، کہ محبت کے اندر بھی وہ اللہ و رسول کے احکام کو مقدم رکھیں۔ ناچار بیویوں ہی کو اپنی بے جا خودداری سے دست بردار ہونا تھا۔ لیکن اعتماد محبت کی زنجیر سخت ہوتی ہے۔ دل سے یہ چاہنے کے باوجود کہ کوئی ایسی بات ہو جائے کہ یہ بے گانگی دور ہو، وہ پہل کرنے سے ہچکچاتی رہیں۔ قرآن نے ''ان تتوبا إلى الله فقد صغت قلوبكما'' کے الفاظ سے ان کی اسی باطنی کشمکش کی طرف نہایت خوبی سے اشارہ کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین اس کو سمجھ نہ سکے اور دل کے اس پر محبت جھکاؤ کو العیاذ باللہ وہ دل کی کجی گمان کر بیٹھے۔'' ۵۴؎

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عائشہؓ و حفصہؓ کے درمیان گہری محبت:

مولانا اصلاحی سیدہ عائشہؓ اور سیدہ حفصہؓ کی شخصیت کو مزید نکھارتے ہوئے اور ان کے سلسلے میں جو غلط فہمی عام ہے، اس کا ازالہ کرتے ہوئے آگے فرماتے ہیں:

''اس امر پر نگاہ رہے کہ یہاں (یعنی وإن تظاهرا علیه میں) جن سیدات کے اتحاد کی طرف اشارہ ہے۔ مشہور روایت کے مطابق وہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ ہیں۔ جن کی نسبت تفسیر روایات سے یا تأثر ملتا ہے کہ ان کے درمیان سوکنوں کے قسم کی چشمک و رقابت برابر رہتی تھی۔ لیکن قرآن کے اس مقام میں ان کا جو کردار بیان ہوا ہے، وہ اس امر کی ناقابل تردید شہادت ہے کہ ان میں ایسی گہری محبت تھی کہ وہ شوہر کے راز میں بھی ایک دوسرے کو شریک کر لیتی تھیں۔'' ۵۵

(۲) سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا یها النبی قل لأزواجک إن کنتن تردن الحیاة الدنیا ۔(آیات:۲۸-۲۹)

ازواج مطہرات اور دنیا طلبی!

حضرت مفسرین نے ان آیات کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ فتح خیبر کے بعد جب مسلمانوں کو فی الجملہ معاشی کشادگی حاصل ہوئی تو آنحضرت ﷺ کی ازواج نے بھی آپ سے مطالبہ کیا کہ ان کو بھی زندگی کی راحتوں اور زینتوں سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے۔ ان کے اس مطالبے پر بطور عتاب یہ آیات نازل ہوئیں۔ مولانا اصلاحی فرماتے ہیں، کئی پہلوؤں سے یہ بات نہایت کمزور ہے:

اول تو قرینہ دلیل ہے کہ یہاں جن حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے وہ ہجرت کے چوتھے یا پانچویں سال سے تعلق رکھنے والے ہیں اور غزوۂ خندق اور بنو قریظہ کے حالات زیر بحث آئے ہیں۔ آگے حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ان تمام واقعات کا تعلق ۵ھ سے ہے۔ خیبر ابھی فتح نہیں ہوا تھا۔ اوپر آیت ۲۷ کے الفاظ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''وأرضا لم تطؤوها'' کے تحت خود مفسرین ہی نے یہ تصریح کی ہے کہ یہ فتح خیبر کی پیشگی بشارت ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ مطالبہ اگر مجرد نان نفقہ میں فی الجملہ توسیع کے لیے تھا، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس پر ان کو یہ نوٹس دے دیا جائے کہ ان کو دے دلا کر ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا جائے۔ اس طرح کی بات پر اول تو کسی تنبیہ کی سزاوار ہی نہیں تھیں۔ اور اگر تھیں بھی تو زیادہ سے زیادہ اس نصیحت کی مستحق تھیں کہ نبیؐ کی معیّت مطلوب ہے تو انہیں صبر وقناعت کی زندگی اختیار کرنی پڑے گی۔

تیسرا یہ کہ امّہات المؤمنین کے متعلق یہ سوءظن نہیں کیا جا سکتا کہ ان پر دنیا کی راحتوں اور زینتوں کا شوق کسی دور میں بھی اتنا غالب آ گیا ہو کہ وہ اس کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ اور معاملہ اتنا سنگین ہو گیا ہو کہ خود اللہ تعالیٰ کو اس میں مداخلت کرنی پڑی ہو۔ اور نوبت اس نوٹس تک پہنچ گئی ہو جو ان آیات میں ان کو دیا گیا۔

شان نزول کی روایت ناقابل توجہ:

''بہر حال یہ شان نزول ہمارے نزدیک قابل توجہ نہیں ہے۔ نہ آیت کے الفاظ سے اس کی تائید ہوتی ہے نہ وقت کے حالات سے۔ ہم یہاں اس سورہ کی روشنی میں وقت کے بعض خاص حالات کی طرف اشارہ کریں گے، جن سے ان آیات کا صحیح موقع ومحل سمجھنے میں مدد ملے گی۔''

آگے مولانا اصلاحی نے اس پوری سورہ کے ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے نہایت تفصیل سے اس وقت کے حالات اور اس دور کے فتنوں پر گفتگو کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس وقت منافقین اور منافقات کی ریشہ دوانیاں ازواج مطہرات پر بھی اپنے جال پھینک رہی تھیں۔ اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے انھیں بدگمان و برگشتہ کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔ اس کے بعد مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ حالات تھے، جن میں یہ آیات اتری ہیں۔ ان میں جو باتیں فرمائی گئیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، ان کو سنانا تو مقصود ہے دراصل ان منافقین اور منافقات کو جن کی ریشہ دوانیوں کے تار و پود ان میں بکھیرے گئے ہیں۔ لیکن وہ پس پردہ تھے، اس وجہ سے قرآن نے ان کو مخاطب کرنے کے بجائے نبی ﷺ اور ازواج نبی رضی اللہ عنہن کو مخاطب کر کے جو کچھ کہنا تھا، کہہ دیا۔

یہاں بلاغت کلام کے اس اسلوب کو یاد رکھیے کہ بسا اوقات ظاہر الفاظ کے اعتبار سے کلام میں خطاب کسی سے ہوتا ہے، لیکن اس میں کوئی عتاب مضمر ہوتا ہے تو اس کا رخ کسی اور طرف ہوتا ہے۔'' ۵۶؎

اعلیٰ کردار کا مظاہرہ:

پھر مولانا کافی تفصیل سے ان آیات کی وضاحت کرتے ہیں۔ آخر میں فرماتے ہیں:

''اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ ان آیات میں ازواج مطہرات پر دنیا طلبی کے جرم میں کوئی عتاب نہیں ہوا ہے، جیسا کہ لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ یہ اللہ و رسول کی طرف سے ان کو آزادی کا پروانہ دے کر ان کے اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کرایا گیا ہے، تاکہ ان منافقین کے حوصلے ہمیشہ کے لیے پست ہو جائیں، جو اس طمع خام میں مبتلا تھے کہ ازواج نبی رضی اللہ عنہن کو دنیا کی کسی طمع کے پھندے میں پھنسا کر اپنی طرف مائل کیا جا سکتا ہے اس اعلان تخییر کے بعد گویا ہر ایک کو حوصلہ آزمائی کا موقع دے دیا گیا، لیکن سب پر ثابت ہو گیا کہ اہل بیت رسالت کا انتخاب خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس حَرم کے اندر کسی کے لیے کسی دراندازی کی گنجائش نہیں ہے۔'' ۵۷؎

(۴) سورۂ حجرات کی ایک آیت ہے:

یا یھا الذین آمنوا إن جائکم فاسق بنبإ فتبیّنوا ۔ (آیت: ۶)

اس آیت کے تحت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

''ایک شخص کو حضرت نے بھیجا ایک قوم پر زکوٰۃ لینے کو۔ وہ نکلے اس کے استقبال کو۔ اسلام سے پہلے اس قوم میں اور اس کی قوم میں بیر تھا۔ یہ ڈرا کہ میرے مارنے کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکلے۔ الٹا بھاگا۔ مدینے میں آ کر مشہور کر دیا کہ فلانی قوم مرتد ہوئی۔ حضرت ان پر فوج بھیجتے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ شہادت فاسق کی قبول نہیں۔'' ۵۸

مولانا مودودی اس پر کچھ اور تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''اکثر مفسرین کا بیان ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔اس کا قصہ یہ ہے کہ قبیلہ بنی المصطلق جب مسلمان ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے ولید بن عقبہ کو بھیجا، تا کہ ان لوگوں سے زکوۃ وصول کر لائیں۔ یہ ان کے علاقے میں پہنچے تو کسی وجہ سے ڈر گئے اور اہل قبیلہ سے ملے بغیر مدینہ واپس جا کر رسول اللہ سے شکایت کر دی کہ انھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔

حضور یہ خبر سن کر سخت ناراض ہوئے اور آپ نے ارادہ کیا کہ ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے ایک دستہ روانہ کریں۔ بنی المصطلق کے سردار حارث بن ضرار (ام المومنین حضرت جویریہ کے والد) اس دوران میں خود ایک وفد لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچ گئے اور انھوں نے عرض کیا کہ خدا کی قسم ہم نے تو ولید کو دیکھا تک نہیں، کجا کہ زکوٰۃ دینے سے انکار اور ان کے قتل کے ارادے کا کوئی سوال پیدا ہو۔ہم ایمان پر قائم ہیں اور ادائے زکوٰۃ سے ہمیں ہرگز انکار نہیں ہے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔'' ۵۹

اکثر مفسرین آیت مذکورہ کی یہی شان نزول بتاتے ہیں۔ لیکن مولانا اصلاحی اسے بالکل ہی لائق التفات نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ اس کی زد بہت دور تک پڑتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ پر بھی اس کی آنچ آتی ہے۔ خلیفۂ راشد حضرت عثمان پر بھی اس کی زد پڑتی ہے۔ رہے ولید بن عقبہ تو ان کی شخصیت تو اس سے بالکل ہی لہولہان ہو جاتی ہے۔

شان نزول جس کی کوئی کل سیدھی نہیں:

مولانا اصلاحی اس شان نزول پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس شان نزول کو درایت کی کسوٹی پر جانچیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلی دلیل:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت میں فاسق کی روایت پر اعتماد کرنے سے روکا گیا ہے۔ جب کہ ولید کے متعلق اس واقعے سے پہلے کوئی بات بھی ایسی لوگوں کے سامنے نہیں آئی تھی، جس سے معلوم ہوسکتا کہ نعوذ باللہ وہ فاسق ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ ان کے فسق کی کوئی شہادت موجود نہیں تھی، بلکہ ان کی ثقاہت وعدالت کا یہ مرتبہ تھا کہ خود نبی ﷺ نے ان کو تحصیل زکوٰۃ کے ذمہ دارانہ منصب پر مامور فرمایا۔ اگر ان کے اندر اس قسم کا کوئی کھوٹ ہوتا تو حضورؐ ان کو اس اہم خدمت کے لیے کس طرح منتخب فرماتے؟

دوسری دلیل:

دوسری بات یہ ہے کہ اس شان نزول کو باور کرلیجیے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ سے اتنے ناواقف تھے کہ ایسے لوگوں کو ذمہ دارانہ مناصب پر مامور فرمادیتے تھے، جو اپنی دروغ بافی سے حکومت اور رعایا دونوں کو خطرے میں ڈال دیں۔ اس قسم کی بے بصیرتی ایک عام معقول آدمی سے بھی بعید از قیاس ہے، چہ جائے کہ اس کا صدور سرور عالم ﷺ سے ہو۔

تیسری دلیل:

تیسری بات یہ ہے کہ اگر ولید استقبال کرنے والی پارٹی کو جنگ جو پارٹی سمجھ کر اس سے ڈر کے واپس آگئے تھے اور اپنا تاثر انھوں نے حضورؐ کے سامنے یہ بیان کیا کہ بنی مصطلق نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کردیا ہے تو ان کی یہ بات سادہ لوحی اور کمزوری تو قرار دی جاسکتی ہے، لیکن از روئے شریعت اس کو فسق نہیں کہا جاسکتا۔ پھر تو اس مضمون کی آیت اترنی تھی کہ مسلمانو! تم اپنے ذمہ دارانہ عہدے ایسے سادہ لوحوں کے سپرد نہ کیا کرو جو استقبال کرنے والوں اور لڑنے والوں کے درمیان امتیاز کرنے سے بھی قاصر ہوں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ ولید اتنے سادہ لوح ہوتے تو کیا حضور ﷺ ان کو ایسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اہم مالی اور سیاسی ذمہ داری سپرد کر دیتے؟ کیا کسی شخص کے اندر سادہ لوحی کوئی ناگہانی طور پر پیدا ہو جانے والی چیز ہے، جو لوگوں سے مخفی رہے۔ یہاں تک کہ خود حضورﷺ کو بھی اس کا اندازہ نہ ہو سکے!۔

چوتھی دلیل:

چوتھی بات یہ ہے کہ یہی ولید ہیں جن کو سیدنا عثمان غنیؓ نے اپنے دور خلافت میں کوفہ کا گورنر بنایا۔ غور کیجیے کہ کیا حضرت عثمان غنیؓ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ یہ شخص از روئے نص قرآن فاسق قرار پا چکا ہے اور گورنری تو در کنار، اسلامی قانون کی رو سے یہ کسی روایت یا شہادت کا بھی اہل نہیں ہے؟ اگر ناواقف تھے تو یہ مانیے کہ حضرت عثمانؓ جیسے خلیفۂ راشد جس کو جامع قرآن ہونے کا بھی شرف حاصل ہے، نعوذ باللہ قرآن کا اتنا علم بھی نہیں رکھتے تھے، جتنا علم شان نزول کی روایتیں کرنے والے ان راویوں کو تھا۔" ۶۰ے

ایک ایک سطر حبّ رسول اور حبّ صحابہ کی غماز:

اس طرح مولانا اصلاحی نہایت ٹھوس اور نا قابل تردید دلائل سے اس روایت کو رد کر دیتے ہیں، اور حال یہ ہے کہ ان کی ایک ایک سطر سے رسول اللہﷺ سے محبت، خلفائے راشدین سے محبت، تمام ہی صحابۂ کرام سے محبت اور ان سب کے لیے اجلال و اکرام کے نہایت بلند اور پاکیزہ جذبات ٹپک رہے ہیں۔

مولانا اصلاحی انھی جذبات سے سرشار ہو کر آگے مزید فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک یہ شان نزول روافض کی ایجادات میں سے ہے جس سے انھوں نے صرف ولید ہی کو بدنام کرنا نہیں چاہا ہے، بلکہ حضرت عثمان کو بھی مطعون کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے یہ جانتے بوجھتے کہ یہ شخص فاسق ہے محض از راہ کنبہ پروری اس کو کوفہ کا گورنر بنا دیا۔" ۶۱ے

(۴) سورۂ جمعہ کی ایک آیت ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وإذا رأوا تجارة أو لهوا انفضوا إليها وتركوك قائما، قل ما عند الله خير من اللهو ومن التجارة والله خير الرازقين۔ (آیت:۱۱)

اس آیت کے سلسلے میں شاہ عبدالقادر دہلوی لکھتے ہیں:

''ایک بار جمعہ میں حضرت خطبہ فرماتے تھے۔ اس وقت بنجارا آیا، اس کے ساتھ نقارہ بجتا۔ پہلے سے شہر میں اناج کی کمی تھی۔ لوگ دوڑے کہ اس کو ٹھہراویں۔ نماز پھر پڑھ لیں گے۔ حضرت کے ساتھ بارہ آدمی رہ گئے۔ انہی سے نماز پڑھی۔ یہ اس پر اترا۔'' ۶۲

اسی آیت کے سلسلے میں مولانا مودودی رقم طراز ہیں:

''یہ فقرہ بتا رہا ہے کہ صحابہ سے جو غلطی ہوئی تھی، اس کی نوعیت کیا تھی۔ اگر معاذ اللہ اس کی وجہ ایمان کی کمی اور آخرت پر دنیا کی دانستہ ترجیح ہوتی، تو اللہ تعالیٰ کے غضب اور زجر و توبیخ کا انداز کچھ اور ہوتا۔ لیکن چونکہ ایسی کوئی خرابی وہاں نہ تھی، بلکہ جو کچھ ہوا تھا، تربیت کی کمی کے باعث ہوا تھا، اس لیے پہلے معلّمانہ انداز میں جمعہ کے آداب بتائے گئے۔ پھر اس غلطی پر گرفت کرکے مربیانہ انداز میں سمجھایا گیا۔'' ۶۳

شاہ عبدالقادر دہلوی نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اس موقع پر تمام ہی صحابہ رسول اللہ ﷺ کو خطبہ دیتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔ وہاں باقی رہنے والے بس بارہ افراد تھے۔ یہی بات تقریباً تمام مفسرین لکھتے ہیں۔ مولانا مودودی اس کی بھی صراحت کرتے ہیں کہ صحابہ کرام سے یہ غلطی تربیت کی کمی کے باعث ہوئی تھی۔ مولانا اصلاحی نے بھی اس موضوع سے تعرض کیا ہے۔ لیکن ان کا انداز ان سب لوگوں سے مختلف ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر کا کوئی تجارتی قافلہ عین خطبۂ جمعہ کے وقت مدینے میں داخل ہوا۔ اس نے اعلان و اشتہار کے لیے، رواج کے مطابق، اپنے ڈھول اور دف جو بجائے تو کچھ لوگ پیغمبر ﷺ کو خطبہ دیتے چھوڑ کر اس کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے...

یہ فعل جن لوگوں سے صادر ہوا، ظاہر ہے کہ ان پر اسلامی تربیت کا رنگ ابھی اچھی طرح چڑھا نہیں تھا... آیت میں بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے، یہ امر واضح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ یہ فعل، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، صادر کچھ ناتربیت یافتہ لوگوں ہی سے ہوا۔

قرآن کا عام انداز موعظت یہی ہے کہ وہ تعیّن کے ساتھ ملامت کرنے کے بجائے عام الفاظ ہی میں متنبہ کرتا ہے۔ تاکہ جماعت کا ہر شخص اس سے فائدہ اٹھائے اور کسی خاص گروہ کو اس سے رسوائی کا احساس نہ ہو۔''۲۴ے

مولانا اصلاحی کے بزرگ استاذ امام حمید الدین فراہی کے قرآنی حواشی میں بھی اس موضوع سے متعلق اسی طرح کی بات ملتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"اتفقت الروايات أنهم تسلّلوا والنبی فی الخطبة والظاهر انهم لم يحسبوا الخطبة لازمة والخطاب إلى رجال معدودة"

(روایتیں متفق ہیں کہ لوگ چپکے سے بھاگ لیے، جب کہ نبی ﷺ خطبہ دے رہے تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ خطبہ سننا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ آیت میں خطاب کا رخ چند ہی افراد کی طرف ہے۔)

جانے والے گنتی کے افراد:

ان دونوں بزرگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ خطبہ سے اٹھ کر جانے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ بس گنتی کے چند افراد تھے جو شاید جلد ہی اسلام لائے تھے۔ ابھی آپؐ کی تربیت سے وہ زیادہ مستفید نہیں ہو سکے تھے اور یہی زیادہ صحیح اور عقل سے لگتی ہوئی بات ہے۔

رہے وہ بزرگ مہاجرین جو اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے، جو دنیا کی ہر طمع سے آزاد اور خالص جنت کے طلب گار تھے۔ جو شعب ابی طالب کے سہ سالہ اجتماعی اور معاشی بائیکاٹ میں فقر و فاقہ کے اس انتہائی مرحلے تک پہنچ چکے تھے، کہ پھر شاید ویسا مرحلہ صحابہ کی زندگی میں دوبارہ نہیں آیا اور وہ اس مرحلے سے انتہائی کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔ ان لوگوں کے سلسلے میں یہ چیز سرے سے ناممکن ہے، چاہے فقر و فاقہ کی کیسی بھی حالت رہی ہو، کہ وہ نبی ﷺ کو چھوڑ کر اس تجارتی قافلے کی طرف دوڑ پڑے ہوں۔

اسی طرح وہ بزرگ انصار جن کے ایثار و اخلاص کی قرآن نے اس شان سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدح کی ہے، کہ یؤثرون علی أنفسھم ولو کان بھم خصاصة، ان انصار سے بھی اس طرح کی بھاری غلطی ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

صحابہ کی شان سے فروتر بات:

لہذا یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی کہ اس موقع پر تمام صحابہ حضورؐ کو چھوڑ کر خرید وفروخت کے لیے مسجد سے بھاگ کھڑے ہوئے اور آپؐ کے گرد بس بارہ افراد رہ گئے۔ یہ صحابہ کے مقام سے نہایت فروتر بات ہے!

ساتھ ہی یہ بات بھی کسی طرح قابل قبول نہیں کہ اکثر صحابہ سے یہ غلطی ہوئی اور یہ غلطی تربیت کی کمی کے باعث ہوئی۔ کیا جو لوگ مکے میں آپؐ کے ساتھ تھے اور آپؐ کے ساتھ مدینے ہجرت کی، یا وہ جو مدینے کا زر خالص تھے، جن کی کیفیت یہ تھی کہ یکاد زیتھا یضیئ ولولم تمسسه نار، ان سارے لوگوں کی ابھی تربیت نہیں ہوسکی تھی؟

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام مقامات کو دیکھنے کے بعد، جن کا ابھی ذکر کیا گیا، یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ شرف صحابیت اور مقام صحابیت کا جو ادراک مولانا اصلاحی اور ان کے استاذ امام فراہی کے ہاں پایا جاتا ہے، وہ دوسروں کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ دوسرے لوگ ان سے بہت پیچھے ہیں۔

ایک طرف یہ حقیقت ہے جو روز روشن سے بھی زیادہ روشن ہے، دوسری طرف یہ الزام ہے کہ فراہی مکتب فکر انکار حدیث، یا اہمال حدیث اور توہین صحابہ کا دوسرا نام ہے۔

ہم ہیں مجروح تو کیا اس میں قباحت ہے حفیظ
سینۂ گل پہ بھی زخموں کے نشاں ہوتے ہیں

نویں خصوصیت:

تدبر قرآن کی نویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ کلام الٰہی کی تفسیر وتفہیم پر ہی اکتفا نہیں کرتی، بلکہ اس کے ادبی محاسن کو بھی بے نقاب کرتی ہے۔ اس میں بلاغت کے جو پہلو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتے ہیں، ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ یہ پہلو عام طور سے تفاسیر میں مفقود ہے، لیکن تدبر قرآن میں اس کا خاص اہتمام ملتا ہے۔

جن تفاسیر میں کلام الٰہی کی بلاغت پر گفتگو ملتی بھی ہے، تو وہ کچھ یوں ہی سی ہوتی ہے۔ بالکل ہلکے پھلکے اور سرسری انداز میں۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی آیت دَین کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

یا یھا الذین امنوا إذا تداینتم بدین إلی أجل مسمی فاکتبوہ ۔(۲۸۲)

امام زمخشری اس آیت کی تشریح کے ضمن میں یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اس آیت میں بس ''إذا تداینتم'' کہہ دیا جاتا، ''بدین'' کا اضافہ نہ کیا جاتا، تو بھی بات پوری ہو جاتی اور مفہوم ادا ہو جاتا، پھر ''بدین'' کا اضافہ کیوں کیا گیا؟ اس میں کیا بلاغت ہے؟۔

پھر وہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں، یہاں ''بدین'' کا اضافہ اس لیے کیا گیا تاکہ آگے آنے والے فعل ''فاکتبوہ'' میں ''ہ'' کی ضمیر اس کی طرف لوٹ سکے۔ اگر خالی ''إذا تداینتم'' کہا گیا ہوتا تو آگے ''فاکتبوا'' کے ساتھ لفظ ''دین'' لانا پڑتا، یعنی اس صورت میں عبادت اس طرح ہوتی: (إذا تداینتم فاکتبوا الدین) اور اس میں وہ خوبصورتی نہ ہوتی جو قرآنی اسلوب میں ہے۔ ۶۵

ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ محض نکتہ برائے نکتہ ہے، جس میں رعنائی اور لطافت نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، جو تفصیل کے طالب ہوں وہ راقم الحروف کی کتاب البرھان فی نظام القرآن میں اس آیت پر تفصیلی نوٹ ملاحظہ فرمائیں۔

یہ ایک مثال ہوئی، ورنہ عام طور سے تفاسیر میں بلاغت کلام سے متعلق ہمیں اسی قسم کی گفتگوئیں ملتی ہیں۔ تدبر قرآن کا حال اس سے مختلف ہے۔ اس میں کلام الٰہی کی بلاغت پر اتنی معیاری بحثیں ملتی ہیں کہ پڑھنے والے کی طبیعت اہتزاز کرنے لگتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن پاک کی آیات میں وہ کون سا اعجاز ہے، جس کے سامنے عرب کے زبان آور خطیبوں اور شاعروں نے، یا صحیح تر الفاظ میں زبان و بیان کے بادشاہوں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شہنشاہوں نے بے اختیار گھٹنے ٹیک دیے۔

اپنی بات کی مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں تدبر قرآن سے دو مثالیں پیش کرتے ہیں:

پہلی مثال:

سورۂ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے غرقاب ہونے کا جہاں تذکرہ ہے، وہاں مضامین کی ترتیب اس طرح ہے، کہ طوفان آ گیا، حضرت نوح اللہ کے حکم سے اپنے ساتھیوں سمیت کشتی میں سوار ہو گئے۔ پہاڑوں جیسی اونچی موجوں کے درمیان کشتی چلنے لگی۔ یکا یک ان کا بیٹا نظر آیا جو الگ تھلگ دور کھڑا تھا۔ حضرت نوحؑ نے اسے آواز دی کہ وہ آ کر کشتی میں سوار ہو جائے۔ اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک موج آئی اور اسے چٹ کر گئی۔ زمین کو حکم ہوا کہ وہ سارا پانی نگل لے۔ آسمان کو حکم ہوا کہ وہ تھم جائے اس طرح پانی تہ نشیں ہو گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر جا کر ٹک گئی۔ حضرت نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا، اے مرے رب! میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے الخ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں کلام کی ترتیب صورت واقعہ سے مختلف کیوں رکھی گئی؟ حضرت نوح نے بیٹے کے لے دعا تو اسی وقت کی ہوگی، جب بیٹا ڈوب رہا تھا۔ لیکن ترتیب کلام اس طرح ہے گویا انھوں نے یہ دعاء اس وقت کی جب طوفان ختم ہو گیا اور کشتی کوہ جودی پر آ کر ٹک گئی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

مولانا اصلاحی اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ دعا حضرت نوحؑ نے اس وقت فرمائی ہے، جب بیٹے کو ڈوبتے دیکھا، اس وجہ سے بظاہر اس کا حوالہ آیت ۴۳ کے ساتھ آنا تھا، لیکن بلاغت کلام کے اقتضاء سے اس کا ذکر مؤخر ہو گیا۔ گویا خدا کی نگاہوں میں یہ شخص حضرت نوحؑ کا بیٹا ہونے کے باوجود ایسا نابکار تھا کہ جب تک خدا نے اس کو غرق نہیں کر لیا، اس کے باب میں حضرت نوحؑ کی دعا کو زیر بحث لانا بھی پسند نہیں فرمایا۔ اس غضب کی وجہ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں اگر کسی انسان کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سب سے بڑی سعادت اور خوش بختی حاصل ہوسکتی ہے تو وہ یہی ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کسی پیغمبر کے گھر میں جنم دے۔ لیکن یہی خوش بختی سب سے بڑی بد بختی بھی ہوسکتی ہے اگر وہ اس کی قدر نہ کرے اور ولی کے گھر میں شیطان بن کر اٹھے۔

چنانچہ کلام کی ترتیب ہی سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ اس شخص کو خدا نے سب سے زیادہ مبغوض قرار دیا۔ گویا سارے طوفان کا ہدف تھا ہی یہی، کہ جب یہ ڈوب گیا تو معاً طوفان کے خاتمہ کا اعلان ہوگیا۔" ۶۶

دوسری مثال:

سورۂ اعراف میں قوم ثمود کے تذکرے میں حضرت صالح کے بارے میں ارشاد ہے:

"فتولی عنهم وقال یا قوم لقد أبلغتکم رسالة ربّی ونصحت لکم ولکن لا تحبون الناصحین. (ایت:۷۹)

اس آیت کی تشریح میں مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

"یہ قوم سے حضرت صالح کا آخری خطاب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انھوں نے عذاب آنے سے پہلے اس وقت فرمایا ہے، جب قوم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر عذاب کے بند کو گویا توڑ دیا ہے۔ یہی وداعی فقرہ کہہ کر انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت فرمائی ہوگی۔ اس لیے کہ رسولوں کے باب میں سنت الٰہی یہ ہے کہ عذاب آنے سے پہلے اللہ کے حکم سے وہ علاقۂ عذاب سے ہجرت کر جاتے ہیں۔" ۶۷

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت صالحؑ نے یہ بات تو عذاب آنے سے پہلے قوم سے رخصت ہوتے ہوئے فرمائی ہے۔ پھر اس کے تین دن بعد عذاب آیا ہے، لیکن قرآن نے حضرت صالحؑ کے اس الوداعی فقرے کو اس طور سے ذکر کیا ہے گویا عذاب پہلے آگیا، اور اس نے پوری قوم کو تباہ کردیا، اس کے بعد قوم کے ملبے سے حضرت صالحؑ نے خطاب کیا، پھر وہاں سے کوچ کیا۔ آخر اس کی کیا حکمت ہے؟

مولانا اصلاحی اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اور اس اسلوب کی بلاغت پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس کا جواب یہ ہے کہ ترتیب میں یہ تقدیم وتاخیر تقاضائے بلاغت سے ہوئی ہے۔ ارتکاب جرم اور اس کے نتیجہ کے فوری ظہور کو نمایاں کرنے کے لیے یہاں عذاب کو قتل ناقہ کے ساتھ متصل کردیا اور حضرت صالحؑ کی ہجرت کے ذکر کو پیچھے کردیا۔ گویا جوں ہی انھوں نے ناقہ کو گزند پہنچا کر خدا کو چیلنج کیا، عذاب آدھمکا۔ عذاب کی یہ سبقت و مبادرت اچھی طرح ظاہر نہ ہوسکتی اگر اس بیچ میں کوئی اور بات ذکر میں آجاتی۔ قرآن میں اس اسلوب مبادرت کی مثالیں بہت ہیں۔ آگے قوم شعیبؑ کی سرگزشت میں بھی اس کی مثال ہے۔ سورۂ ہود میں حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے سلسلے میں آیات ۴۴-۴۵ ملاحظہ ہوں۔ نہایت واضح اور بلیغ مثال اس اسلوب کی موجود ہے۔'' ۶۸ؔ

تدبر قرآن میں ہم جگہ جگہ دیکھتے ہیں کہ مولانا اسی طرح آیات کی بلاغت پر روشنی ڈالتے ہوئے چلتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ مولانا نے جتنے بھی بلاغت کلام کے نکتے بیان فرمائے ہیں، یہ سب پہلی بار ہمارے سامنے آئے ہیں۔ یہ وہ نئے نئے انمول موتی ہیں جو مولانا اصلاحی نے خود بحر قرآن میں غوّاصی کرکے دریافت کیے ہیں اور نہایت خوبصورتی سے تدبر قرآن کے فریم میں سجا کر ہمارے سامنے رکھ دیے ہیں۔

تدبر قرآن کے ان مقامات کو دیکھ کر یقین کرنا پڑتا ہے کہ مولانا اصلاحی نے کچھ بھی مبالغے سے کام نہیں لیا ہے، جس وقت اپنے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ:

''میں نے قرآن حکیم کی ایک ایک سورہ پر ڈیرے ڈالے ہیں۔ ایک ایک آیت پر فکری مراقبہ کیا ہے اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک ادبی یا نحوی اشکال کے حل کے لیے ہر اس پتھر کے الٹنے کی کوشش کی ہے، جس کے نیچے مجھے کسی سراغ کے ملنے کی توقع ہوئی ہے اور یہ راز بھی میں برملا ظاہر کرتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی اس کام میں کوئی تکان یا افسردگی محسوس نہیں کی، بلکہ ہمیشہ نہایت گہری لذت اور نہایت عمیق راحت کا احساس کیا ہے۔'' ۶۹ؔ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دسویں خصوصیت:

تدبر قرآن کی دسویں خصوصیت یہ ہے کہ مولانا اصلاحی نے علم و حکمت کی جو شراب طہور تیار کی ہے، اس کے لیے ویسی ہی خوب صورت صراحیاں اور شیشے بھی فراہم کیے ہیں۔ اسرار و معارف کے جیسے بے بہا موتی اکٹھا کیے ہیں، ان کو ویسے ہی روشن، پروقار، شیریں اور وجد آفریں الفاظ و اسالیب کے ظرف میں پیش بھی کیا ہے۔

واقعہ ہے کہ تدبر قرآن کا ادبی پایہ نہایت بلند ہے۔ کلاسیکل (Classical) ادب کے جو بھی بنیادی اوصاف ہو سکتے ہیں، ان تمام اوصاف سے وہ آراستہ ہے۔ اس کے اندر سادگی بھی ہے، پرکاری بھی ہے، دل کشی بھی ہے، دل نشینی بھی ہے، رعنائی بھی ہے، طربناکی بھی ہے، جلال بھی ہے، جمال بھی ہے، اسلوب کی حلاوت بھی ہے، الفاظ کی شوکت بھی ہے۔ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفاں بھی ہے اور جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم بھی ہے۔

ہم ذیل میں تدبّر کے چند ادبی شہ پارے پیش کرتے ہیں، جس سے اس کی ادبی حیثیت کا اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا۔

(۱) سورۂ بقرہ کی آیت ہے:

نساؤکم حرث لکم فأتوا حرثکم أنی شئتم۔ (آیت:۲۲۳)

اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''ہر شخص جانتا ہے کہ ازدواجی زندگی کا سارا سکون و سرور فریقین کے اس اطمینان میں ہے کہ ان کی خلوت کی آزادیوں پر فطرت کے چند موٹے موٹے قیود کے سوا کوئی قید، کوئی پابندی اور کوئی نگرانی نہیں ہے۔ آزادی کے اس احساس میں بڑا کیف اور بڑا نشہ ہے۔ انسان جب اپنے عیش و سرور کے اس باغ میں داخل ہوتا ہے تو قدرت چاہتی ہے کہ وہ اپنے اس نشے سے سرشار ہو، لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے قدرت نے رکھ دی ہے، کہ یہ کوئی جنگل نہیں، بلکہ اس کا اپنا باغ ہے، اور جس شان،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس آن، جس سمت اور جس پہلو سے چاہے آئے، لیکن اس باغ کا باغ ہونا اور کھیتی کا کھیتی ہونا یاد رکھے۔ اس کے کسی آنے میں بھی اس حقیقت سے غفلت نہ ہو۔'' ۷۰

(۲) سورہ مائدہ کی آیت ہے:

قال رجلان من الذين يخافون أنعم الله عليهما ادخلوا عليهم الباب فإذا دخلتموه فإنكم غالبون. (آیت:۲۳)

مولانا اصلاحی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اس میں شبہ نہیں کہ جب پوری قوم کی قوم اس طرح ہمت ہار بیٹھے، جس طرح بنی اسرائیل ہار بیٹھے، تو بہادر سے بہادر آدمی کے اعصاب بھی جواب دے جاتے ہیں۔ بڑا ہی باوفا اور صداقت شعار ہوتا ہے وہ مردِ حق جو ایسے نازک موقع پر بھی اپنی وفاداری اور صداقت شعاری نباہ لے جائے۔ یوشع اور طالب کے کردار کا یہی پہلو ہے، جس کے سبب سے عہد و میثاق کی اس سورہ میں قرآن نے ان کا ذکر کر کے ان کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ تاکہ جو لوگ خدا کی راہ پر چلنے کا ارادہ کریں، وہ ان کے اس مثالی کردار سے یہ سبق لیں کہ جب سب سو جائیں تو جاگنے والے کس طرح جاگتے ہیں۔ اور جب سب مر جاتے ہیں، تو زندہ رہنے والے کس طرح زندہ رہتے ہیں۔ قرآن نے یہاں بزدلوں کے اندر بہادروں اور مردوں کے اندر کے زندوں کو اس لیے نمایاں کیا ہے کہ بہادروں کے اندر بہادر اور زندوں کے اندر زندہ تو بہت نظر آ جائیں گے، لیکن وہ زندگی بخش ہستیاں بہت کم یاب ہیں جو مردوں کو زندگی بخشتی ہیں، اگرچہ اسی راہ میں انہیں خود اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔'' ۷۱

(۳) سورۂ مائدہ کی آیت ۲۶ کے ضمن میں مولانا لکھتے ہیں:

''تم اپنے آپ کو اللہ کا محبوب اور چہیتا سمجھتے ہو۔ اگر تمہارا یہ گمان کچھ حقیقت رکھتا ہے، تو موسیٰ کی موجودگی میں تو تم اور بھی زیادہ چہیتے تھے۔ پھر اس وقت ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے ڈگ ڈال دیے تھے تو خدا خود تمہیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جاتا اور فلسطین کا بادشاہ بنا دیتا۔'' ۷۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) سورۂ انعام آیت ۵۳ کے ضمن میں مولانا رقم طراز ہیں:

''نتیجہ اس کج فہمی کا یہ نکلا کہ اب وہ یہ کہنے لگے کہ اسلام اگر کوئی فضیلت کی چیز ہوتی، تو کیا اس سے سرفراز کرنے کے لیے خدا کو یہی اراذل و اجلاف اور یہی حقیر و نادار لوگ مل سکے؟ آخر ہم اشراف و اعیان، سرداران قریش اور رؤسائے طائف کہاں مر گئے تھے کہ آسمان سے یہ نعمت اتری تو ہمارا پتہ اس کو نہ مل سکا۔ اور وہ ان پر جا کر نازل ہو گئی!

قرآن نے ان کے اس تمرّد کے جواب میں فرمایا: أليس الله بأعلم بالشاكرين۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کا دین سونا اور چاندی، ریشم اور مخمل نہیں ہے، جس کی کاٹھی اور جس کے جھول گدھوں اور خچروں، گھوڑوں اور اونٹوں پر بھی نظر آ جاتے ہیں۔ یہ تو آسمانی نعمت اور یزدانی رحمت ہے، جو صرف ان کا حصہ ہے جو ہر حال میں اپنے رب کے شکر گزار رہے۔''۳۷

یہ چند مثالیں ہیں۔ ورنہ تدبر قرآن میں اس طرح کے ادبی شہ پاروں کی کمی نہیں۔ مولانا کا یہ ادبی اسلوب تحریر آیات کی تشریح میں بڑی جان ڈال دیتا ہے اور قاری بے اختیار اس بحر علم کی پرسکون لہروں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔

یہ ہیں تدبر قرآن کی وہ خصوصیات جو اسے تفاسیر کے درمیان ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ اور اسے بالکل ایک منفرد تفسیر قرار دیتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا اصلاحی نے تدبر قرآن لکھ کر قرآنی لائبریری میں ایک زبردست اضافہ کیا ہے۔ اہل علم اور اہل ذوق کبھی ان کے اس احسان کو فراموش نہیں کر سکتے۔

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور فردوس بریں میں انہیں صالحین اور صدیقین کی معیت نصیب فرمائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حواشی:

۲۷- تدبر قرآن، ۱/۵۱۲
۲۸- امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۸ء، ۷/۱۹۳
۲۹- تدبر قرآن، ۹/۶۵۰-۶۵۱
۳۰- امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۶ء، ۵/۳۶۶
۳۱- نفس مصدر، ص ۳۶۴
۳۲- تدبر قرآن، ۱/۷
۳۳- امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۷ء، ۶/۱۶۵-۱۶۶
۳۴- تدبر قرآن، ۶/۱۹۵
۳۵- حوالہ سابق
۳۶- تدبر قرآن، ۳/۵۱۱
۳۷- شبیر عثمانی، القرآن الکریم وترجمۃ وتفسیرہ الی اللغۃ الاردیۃ، ص ۸۰۷
۳۸- سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۷ء، ۶/۵۵۳
۳۹- تدبر قرآن، ۹/۶۶۲-۶۶۳
۴۰- تدبر قرآن، ۶/۲۳۵
۴۱- تدبر قرآن، ۵/۲۷۱
۴۲- تدبر قرآن، ۶/۵۲۴
۴۳- تدبر قرآن، ۱/۵۱۰
۴۴- تدبر قرآن، ۱/۶۷۳
۴۵- تدبر قرآن، ۲/۱۴۵
۴۶- تدبر قرآن، ۷/۴۹۰
۴۷- تدبر قرآن، ۵/۲۲۳-۲۲۴
۴۸- شبیر احمد عثمانی، ص ۷۴۳
۴۹- الزمخشری، الکشاف، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۷ء، ۴/۵۷۰
۵۰- فخر الدین رازی، التفسیر الکبیر، تحقیق وتعلیق وتخریج حماد زکی البارودی، المکتبۃ التوفیقیۃ، القاہرۃ، ۳۰/۴۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۱- القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۹۸۷ء، الجزء الثامن عشر،ص ۱۸۸

۵۲- ابوحیان الاندلسی، البحرالمحیط، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۰ء، ۸/ ۲۸۸

۵۳- تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۸ء، ۸/ ۴۶۵

۵۴- نفس مصدر، ص ۴۶۶-۴۶۷

۵۵- نفس مصدر، ص ۴۶۷

۵۶- تدبر قرآن، ۵/ ۲۱۷

۵۷- نفس مصدر، ص ۲۱۸

۵۸- شاہ عبدالقادر، موضح القرآن، مکتبہ ہدایت، دہلی، ص ۶۶۹

۵۹- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۸ء، ۵/ ۷۳-۷۴

۶۰- تدبر قرآن، ۶/ ۴۹۶-۴۹۷

۶۱- نفس مصدر، ص ۴۹۷

۶۲- موضح القرآن، ص ۷۱۹

۶۳- تفہیم القرآن، ۵/ ۵۰۵

۶۴- تدبر قرآن، ۸/ ۳۸۷

۶۵- الکشاف، ۱/ ۴۰۲

۶۶- تدبر قرآن، ۳/ ۳۹۴

۶۷- تدبر قرآن، ۳/ ۳۰۴-۳۰۵

۶۸- حوالہ سابق

۶۹- تدبر قرآن، مقدمہ، ۱/ ۴۱

۷۰- تدبر قرآن، ۱/ ۴۸۳

۷۱- تدبر قرآن، ۲/ ۲۶۲

۷۲- تدبر قرآن، ۲/ ۲۶۴

۷۳- تدبر قرآن، ۲/ ۴۳۶-۴۳۷

© rasailojaraid.com